علامت، معنیاتی تفاعل اور اردو ناقدین

Symbol,Semantic Functionality, and Urdu Critics

ڈاکٹر محمد راشد سعیدی
لیکچرار اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور
ڈاکٹر لیاقت علی
پروفیسر شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

Abstract:

Symbol, the subsequent stride in metaphorical expression and also known as an emblem or sign, holds a pivotal role in literature, particularly in poetry. Within the realm of modern Urdu poetry, it assumes a foundational status, serving as the bedrock of manifold ambiguity. Scholars of Urdu literature harbor diverse and myriad interpretations regarding symbolism.While some perceive it as latent within the text yet integral in meaning, others attribute its essence to the fluidity of meanings inherent in literary compositions. By synthesizing the perspectives of various critics, this article endeavors to elucidate the essence of symbolism. Such elucidation aids in unraveling the structural and formative underpinnings of literary works, thus guiding readers toward a comprehensive grasp of the profound connotations enshrined within the text.

کلیدی الفاظ: علامت، استعارہ، تنقید، تعبیر، کثرتِ معانی، ابہام

علامت کے مباحث اردو ادب میں کچھ زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ استعارہ و علامت کا ایک روایتی تصور کلاسیکی شاعری میں موجود تھا تاہم نظم نگاری بالخصوص جدید شاعری کے ساتھ علامت نے رواج پایا اور تنقید میں اس پر غور و خوض کر کے اس پر سنجیدہ مباحث کی بنیاد رکھی گئی۔ دراصل اردو میں ترقی پسند تحریک نے واضح اور

سو فیصد ابلاغ پر اس قدر زور دیا کہ نکتہ رس اور ہمہ گوں ادیبوں نے اس کو جبر سمجھا؛ کہ ان کے نزدیک ادب معنی آفرینی کا نام تھا۔ چند ادیبوں نے چپکے سے اپنی راہ الگ کی تو اس وقت کچھ ادیبوں نے ترقی پسندی کے ردّ عمل کے طور پر علامتی و تجریدی ادب لکھنے کا آغاز کر دیا۔ اردو میں جدیدیت کی تحریک کے ساتھ جو علامت اور تجرید بنیاد 'نئی شاعری' اور 'نیا افسانہ' لکھا گیا اس کی وجہ سے علامت، اظہار ابلاغ اور ترسیل کے مباحث مرکز میں آ گئے ۔یوں علامت پر اس قدر لکھا گیا کہ مختلف ناقدین کی وجہ سے علامت کے مختلف تصورات رواج پانے لگے ۔علامت کو اس کے لغوی معنوں میں اشارہ سمجھا گیا تو کچھ لوگوں نے جدید لسانیات تناظرات کے تحت اس کو sign اور symbol کا نام دیا۔ کچھ کے نزدیک یہ استعارے کی ترقی یافتہ اور توسیع شدہ شکل ہے جسے شعوری طور پر برت کر کلام کو ابہام اور کثرتِ معنی کا حامل بنایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے مغربی علامتی تحریک سے جوڑ کر دیکھتے ہیں تو کچھ اسے اردو جدیدیت کا منفی رجحان قرار دیتے ہیں جس نے ادب کو عدم ابلاغ اور منفیت کا حامل بنا دیا۔ کچھ کے نزدیک علامت کی جڑیں تہذیب و ثقافت میں ہوتی ہیں کہ دھرتی سے تعلق جوڑے بغیر علامت ابلاغ نہیں کرتی، کچھ اسے فرد کی ذات سے ابھرتے ہوئے معانی قرار دیتے ہیں، اسی طرح بعض ناقدین کے نزدیک علامت کا کام قاری کو متحرک کرنا ہے، اگر علامت قاری کو متحرک کرنے اور اس پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہتی ہے تو اس کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔(1)۔ ذیل میں حتی المقدور زمانی ترتیب کے پیشِ نظر اردو ناقدین کے علامت کے حوالے تصورات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اردو میں علامت کا کوئی واضح تصور سامنے آ سکے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۷۳ء) علامت کو اشارہ کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ اشارہ کی بنیاد کسی عضو کی مدد سے کسی شے کی جانب متوجہ کرنا اور بات سمجھانا ہے، جب کہ ادب میں مختصراً الفاظ میں کوئی بات سمجھانا اشارہ یا علامت کہلاتا ہے۔ علامت؛ تشبیہ اور استعارہ سے آگے بڑھ کر لفظ میں موجود معانی کے اسرار کھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ استعارہ تشبیہ کا اگلا قدم ہے اور علامت استعارے کا۔ اسی طرح طویل استعارہ کو تمثیل کہا جاتا ہے، اس پر استعارہ ہی کے اصول لاگو ہوں گے۔ تشبیہ حقیقت کا مظہر ہوتی ہے جب کہ استعارہ اور علامت مجاز کے۔ تشبیہ میں مشبہ بہ کے حقیقی معنی مراد لیے جاتے ہیں جب کے استعارے میں مشبہ بہ (جسے استعارہ کے عمل میں مستعار منہ کہتے ہیں) مشبہ (مستعار لہ) کی جگہ، اسی کے ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور وہاں مشبہ (مستعار لہ) کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔ یعنی مستعار منہ اپنے اصلی معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ مستعار لہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ استعارے میں کوئی ایسا لفظ یا قرینہ موجود نہ ہو، جو یہ قرینہ ظاہر کرے کہ مستعار لہ اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوا تو قاری اس کے حقیقی معنی ہی سمجھے اور استعارے تک رسائی

حاصل نہیں کر پائے گا۔یعنی شوکت سبز واری استعارے کے لیے خارجی قرینہ لازمی قرار دیتے ہیں، جس کی ضرورت علامت کے عمل میں نہیں ہوتی۔ علامت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہوتا جو مجازی معنی کی طرف اشارہ کرے، لہٰذا یہاں قرینہ خارجی کی بجائے داخلی اور ذہنی ہوتا ہے۔(2)۔ شاعر اور قاری کے درمیان ایک مفاہمت ہوتی ہے، جس میں قاری کے کندھوں پر متن سے علامتی معانی اخذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے ۔علامت میں موجود مفاہمتی معاہدے میں خارجی اور ذہنی پابندی دراصل علامت کو منطق کا پابند بناتی ہے، آزاد نہیں چھوڑتی۔ جب علامت نگار ذات کی گہرائیوں سے وجودی طرز کی،عدم ابلاغ کی حامل علامتیں خلق کرتے ہیں تو وہ منطقی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ملارمے اور میراجی ایسے علامت نگاروں نے قاری کا لحاظ نہ کرتے ہوئے شاعر کو معمہ بنا دی دیا۔ڈاکٹر سبز واری کے مطابق:

> " شاعری جب معمہ بن جاتی ہے تو اس کا اصل مقصد یعنی افہام و تفہیم یا ارسال و تبلیغ خاک میں مل جاتا ہے۔ اردو میں میراجی نے میلارمے کی تقلید میں قاری کے ذہن سے مناسبت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مفاہمت کے بغیر وہ اشارات استعمال کرتے رہے۔اس کا استعمال یہی ہونا تھا کہ بقول غالب " کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی " ان کی بات کسی کو سمجھ میں نہیں آئی۔ (3)

ڈاکٹر شوکت سبز واری نے استعارے کے لیے ظاہری قرینے کو ناگزیر قرار دے کر استعارے کی حدود متعین اور محدود کر دی ہیں، جس سے استعارہ فقط تشبیہ کی توسیع بن گیا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو ان کا علامت / اشارہ کا تصور بھی مثبت اور وسیع نہیں ہیں۔ وہ خارجی قرینے کے ضمن میں منطقی پابندی کرنے کا کہہ کر قاری کے تفاعل اور اس کی صلاحیت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وسیع المطالعہ، منطقی اور تربیت یافتہ قاری کے لیے جدید علامتیں عدمِ بلاغ کی حامل نہ ہوں۔ مذکورہ مضمون کی اشاعت کے وقت (۱۹۶۱ء) ہو سکتا ہے کہ میراجی اور ملارمے کی گرہ کشائی نہ ہوئی ہو تاہم اکیسویں صدی کے لمحۂ موجود میں میراجی فہمی پر گراں قدر کام سامنے آ چکا ہے جو یہاں مضمون نگار کے مؤقف کو کمزور ثابت کرتا ہے۔

صدیق کلیم کا ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آنے والا مضمون "علامتی اظہار" استعارہ اور علامت کے مابین فرق اور ادب میں اس کے ابلاغ کو موضوع بناتا ہے۔ ان کے مطابق علامت کا استعمال اردو میں نیا نہیں، کلاسیکی شاعری میں، شراب، شمع، آسمان، موسیٰ اور ابلیس کی علامتی مستعمل تھیں، لیکن یہ علامتوں کے معانی متعین تھے، آزاد نہیں۔ صدیق کلیم کے نزدیک استعارہ کے دو مطالب ہوتے ہیں جب کہ علامت دو قسم کی ہوتی ہے ۔استعارہ کا ایک مطلب تو اس کے اپنے نشان ہونے کی قدر ہے، یعنی اس کا اپنا لغوی معنی جب کہ دوسرا مطلب

بطور اس چیز کے جس کا یہ نشان ہے، یعنی مستعار لہ۔ مگر علامت فقط اپنے نشان ہونے کی قدر ہے۔ مضمون نگار اس طرح استعارہ اور علامت ہر دو کے امکانات کو محدود کر دیتے ہیں، استعارہ ان کے نزدیک فقط دو معانی کا حامل ہوتا اور علامت فقط ایک۔ جب کہ وہ دوسری قسم کی علامت کے بھی قائل ہیں جو کہ جدید علامت ہے۔ وہ جدید علامت کے حوالے سے یہ رعایت دیتے ہیں کہ یہ اپنی 'گمبھیرتا' کے باعث کثیر المعنویت کی حامل ہو سکتی ہے۔ بقول صدیق کلیم:

> "علامت اس شاعری میں معنی کے لحاظ اسے پیچیدہ اور موہوم ہو جاتی ہے جس سے ابہام پیدا ہوتا ہے اور پیرائیہ اظہار میں وہ وضاحت نہیں رہتی جو غیر علامتی شاعری کی خصوصیت ہے اگرچہ یہ شاعری بھی اپنے بعض تقاضوں کے لحاظ سے گمبھیر بھی ہے اور مبہم بھی۔ (4)

صدیق کلیم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ علامت پیچیدگی اور ابہام کا باعث ہوتی ہے لیکن وہ ابہام منفی تاثر کے طور پر لیتے ہیں جو شاعری میں وضاحت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ درحقیقت صدیق کلیم ذاتی اور شخصی علامت کو مناسب خیال نہیں کرتے، جو خارجیت کو یکسر نظر انداز کر کے داخلی اور ذاتی تجربے پر استوار ہوتی ہے، ان کے نزدیک اس نوع کی علامت ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وہ ابہام اور جدید علامت کی حامل شاعری کو شعریت کے لیے دشمن سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک:

۱۔ ابہام شاعری کے حسن کو کم کر دیتا ہے یا ختم کر دیتا ہے۔

۲۔ ابہام کی وجہ سے اظہار ناکام ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایسی شاعری میں وحدت اور نظم و ضبط کا استعمال نہیں ہوتا۔

۴۔ یہ طوالت کی حامل نظمیں ہوتی ہیں، جو کہ مناسب نہیں۔

۵۔ ان میں اخلاقی یا فلسفیانہ مباحث کی نفی ہوتی ہے۔

۶۔ تجزیاتی انداز، خود شعوریت اور خود ارادیت کی زیادتی قاری کو صدمہ پہنچاتی ہے۔

۷۔ شاعری اور عقیدے کے قدیم رشتے کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے۔ (5)

صدیق کلیم کی اوّلیں وضاحت فقط علامت اور ابہام سے ان کی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی ہے، تاہم درج بالا نکات ان کے تصورِ شاعری اور اس میں ابہام کی وجہ سے پیدا ہونے والی کجیوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ شاعری کو اخلاق، فلسفہ اور مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور انھی پیغامات کی ترسیل کو شاعری کا حسن۔ چونکہ علامت و استعارہ

اور ان کی وجہ سے پیدا ہونا والا اظہار شاعری میں گہرائی اور بو قلمونی پیدا کر دیتا ہے جس سے پیغام کی قطعیت اور وضاحت متاثر ہوتی ہے جو کہ صدیق کلیم کی نظر میں شاعری کا نقصان ہے۔

ڈاکٹر ابنِ فرید (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۳ء) کا مضمون "علامت نگاری کا تصورِ زمانی و مکانی" فلسفیانہ بنیادوں پر علامت کی تشکیل اور تفہیم پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو موضوع بناتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر علامت کا تہذیبی اور سماجی رُخ زیادہ ہے تاہم وہ ادبی رُخ کو بھی مکمل طور پر نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے مطابق علامت علامت / سمبل یونانی لفظ سمبالین (Symbaline) سے ماخوذ ہے جس کے معانی 'چیزوں کو ایک ساتھ رکھنا' کے ہیں۔ یعنی ایک شے کی بجائے دوسری شے کا استعمال۔ مضمون نگار کے نزدیک علامت کی تشکیل اور تفہیم میں دو بنیادی ابعاد کو قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ا۔ بعد زمانی (Time Dimension)، ۲۔ بعد مکانی (Spacial Dimension)۔ انھوں نے کارل ینگ [Karl Jung] (۱۸۷۵ء۔۱۹۶۱) کے حوالے سے علامت کی دو اقسام کا ذکر کیا ہے۔ اوّل: عارضی، دوم: دائمی۔ عارضی علامتیں وقتی ہوتی ہیں اور قلیل عرصے میں فنا ہو جاتی ہیں جب کہ دائمی علامتیں جلدی فنا نہیں ہوتیں۔ ان کے نزدیک علامت نشان کی طرح اتنی سادہ اور اکہری نہیں ہوتی کہ اسے بادی النظر میں سمجھ لیا جائے بلکہ اس کی سطح بلند اور نوعیت پیچیدہ ہوتی ہے۔ علامت انسان کے ماضی کے ساتھ مستقبل میں انسانی آرزوؤں اور امکانات کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابنِ فرید نے علامت کے اس تفاعل کی بنیاد اس کے بعدِ زمانی کو قرار دیا، جب کہ بُعد مکانی کے لیے ایرک فرام [Erich Fromm] (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۰ء) سے رجوع کرتے ہیں۔ ایرک فرام کے نزدیک علامتیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ اوّل: روایتی، دوم: اتفاقی، سوم: آفاقی۔ روایتی علامتیں کسی مخصوص معاشرے کی میراث ہوتی ہیں، جب کہ اتفاقی علامتیں زمانی اور عارضی ہوتی ہیں، اسی طرح آفاقی علامتیں عالم گیری ہوتی ہیں اور تمام تہذیبوں میں شناخت کی جاتی ہیں۔ اس تقسیم میں زمانی بعد کا بھی ذکر ہے تاہم مکانی بعد یہاں نیا تناظر فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح علامت سازی میں ایک تیسرے بُعد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہے فرد کا تعامل۔ یہی تینوں ابعاد ہی علامت پر ہر طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ فرد، زمان اور مکان کے تعامل سے ہی کوئی علامت تشکیل پائے گی ورنہ نہیں۔ علامت سازی اور علامت فہمی بھی تینوں عوامل کو یکساں اہمیت دینا ہو گی۔

کوئی بھی علامت کسی خاص دورانیے میں کسی خاص تہذیب و ثقافت کے زیرِ اثر ہی تشکیل دی جاتی ہے۔ کسی بھی تصور کے حوالے سے ایک ثقافت میں نقطۂ نظر الگ ہوتا ہے دوسری میں الگ اسی طرح ایک دور میں ایک تصور کو ایک انداز میں دیکھا جاتا ہے تو کسی دوسرے دور میں الگ انداز سے۔ یعنی علامت کی تفہیم کے لیے

اس کا متعلقہ دور اور ثقافتی حلقہ جاننا ضروری ہے۔ عورت کی آزادی کی مثال لیں تو اس کے معنی ہر دور اور ہر ثقافت میں الگ الگ لیے گئے ہیں۔ کسی انفرادی علامت کی تشکیل کے دوران میں فرد، جو کہ علامت ساز ہے، اس کے تجربے کو بھی اس کی ذات تک نہیں محدود رکھنا چاہیے، کیونکہ وہ اپنے سماج پر اور سماج اس کی فکر پر اثر انداز ہو رہا ہوتا ہے۔ جب فرد علامت کو ذاتی میراث سمجھتا ہے تو ابلاغ و ترسیل نہیں کر پاتا، اس کی علامت خود کلامی رہ جاتی ہے۔(6)

ابنِ فرید اپنے مضمون "دیومالا اور علامت" میں اساطیر کی استعاراتی اور علامتی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دیومالا / اساطیر حقیقت کو بعینہٖ پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کی پیش کش میں انسانی خواہش کی کارفرمائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مضمون نگار کے مطابق دیومالا اپنی کلی حالت میں علامت نہیں ہوتی، کیوں کہ علامت کے لیے متن کا ایک کل ہونا لازم ہے۔ دیومالا مجموعی طور پر علامت نہیں ہوتی، تمثیلی ہوتی ہے جس میں کئی استعارے اور استعاراتی سلسلے ہوتے ہیں۔ دیومالا میں موجود ہستیاں، ان کی اشیا اور اعمال بھی استعارے بھی ہو سکتے ہیں، علامت بھی۔(7)۔ یہ سب قرأت اور تعبیر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ہر قرأت اپنے دور، زمانے اور ترجیحات کے مطابق کی جاتی ہے اور دیومالائی متن ہر قرأت میں متنوع معانی فراہم کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

ابنِ فرید کا علامت کو سمجھنے کا نقطۂ نظر دل چسپ ہے اور معنی خیز بھی۔ وہ علامت کو سمجھنے کے لیے وسیع تر اور متنوع تناظرات فراہم کرتے ہیں اور علامت کو کثیر معانی فراہم کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں، لیکن وہ ذاتی سطح کی علامت کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ وہ فرد سے ذات سے اخذ کردہ علامت کو خود کلامی کہہ کر تخلیق کار کی فکر پر پابندی عائد کرتے ہیں جو تخلیقی پرواز کو محدود اور متعین کر دینے کے مماثل ہے۔

محمد حسن عسکری کے نزدیک بھی علامت ایک خاص طرح کے ابہام ہی کی باعث ہوتی ہے، وہ علامت کو قاری اور خالقِ متن دونوں کی سطح پر دیکھتے ہیں۔ وہ ادبی علامت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> "ادبی علامت دراصل مصنف اور قاری کی باہمی تخلیق ہوتی ہے اور اسی کے باعث ادبی علامتوں میں، قوت، تخلیقی ابہام اور اظہار کی ایسی غیر یقینیت پیدا ہو جاتی ہے جو علامتی نظام میں وسعت، لچک اور ہمہ سمتی حرکت کو جنم دیتی ہے۔(8)

علامت کا ماحول چونکہ خود اسی کا تعمیر کردہ ہوتا ہے جس کے باعث کوئی نظریاتی تجربہ اور فلسفیانہ فکر ادبی علامت کا مکمل احاطہ نہیں کر پاتی۔ علامت تحدید اور وسعت ہر دو کی حامل ہوتی ہے۔ یہ فرد اور ماحول، وحدت اور کثرت، پیکر اور متن کے درمیان تحدید بھی قائم کرتی ہے اور وسعت بھی۔ علامتی ادب میں اشیا اور ان کے

دیکھنے والوں کے درمیان معانی کے رشتے کو ختم کر دیا جاتا ہے اور ان کو ایک ایسی مطلقیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے شے اور اس کے مشاہدہ کرنے والے میں مادی اور منطقی رشتہ ختم ہو جاتا ہے اوہ وہ تمثیلی اور علامتی رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ علامت کی تخلیق فقط خارجی بنیادوں پر نہیں ہوتی، علامت میں مادی، روحانی، جزوی، کلی، امکانی اور زمانی وارداتوں کو یک جا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح علامت میں موجود داخلی اور خارجی تضاد اسے ایک لفظ نہیں رہنے دیتا بلکہ یہ ایسی توانائی بن جاتی ہے جو طویل عرصے تک انسانی ذہن کو متاثر کر سکتی ہے۔ تاہم علامت کا قاری کی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک داخلی تضادات کی تفہیم کر کے معنی خیزی کے عمل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ عسکری صاحب کے نزدیک ہر علامت خود مکتفی اور آزاد ہوتی ہے جو کسی غیر ادبی اور نظریاتی اصول کی پیروی نہیں کرتی۔

محمود ہاشمی(۱۹۳۹ء۔ ۲۰۰۹ء) کا مختصر مضمون "علامت اور نیا تخلیقی تصور " اردو جدیدیت کا تصورِ علامت لیے ہوئے ہے۔ اس مضمون میں اگرچہ بنیادی تصورات اور علامت کے ابعاد کی وضاحت نہیں کی گئی ، تاہم جدیدیت پسندوں کا علامت کے حوالے سے رویہ ضرور سامنے آجاتا ہے۔ محمود ہاشمی کا اس مضمون میں رویہ انکار اور استرداد کا ہے۔ ان کے نزدیک ہر نظریے، ہر صورتِ حال اور ہر فلسفے کی حدود ہوتی ہے ان حدود کے بعد تازگی اور نئے پن کی ضرورت پڑتی ہے جو یہ نظریات مہیا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن کے نقالی کے یونانی تصور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح اُس نظریے کے عروج کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ نظریات اب ادب و فن میں کچھ نیا دینے سے قاصر ہیں۔ نئی ثقافت، نیا تمدن اور نئے حالات نئے معانی کے متقاضی ہیں جو انھیں علامت ہی سے میسر آسکتے ہیں۔ علامت کی 'علامیت' میں موجود اختصار کے اندر وہ قوت ہے کہ جو فن وفکر اور ادب وفلسفہ میں آنے والا خلا کو پُر کر سکتا ہے۔ یہ علامتی اختصار جو میراجی اور ان جیسے دیگر شعرا کے ذریعے رجحان بن رہا ہے، بقول محمود ہاشمی انسانی مسائل کے راز اس میں مضمر ہیں:

> " دراصل ہزاروں برس کے علم وفن اور فلسفہ کے عمیق و بسیط بحر ذخار میں انسان کہ تلاش و تحقیق کا ثمر ہے ---دراصل علامت کے بنیادی تصور میں ہی تمام انسانی مسائل کا راز پوشیدہ ہے اور اسی میں ادب کے نئے آہنگ اور نئے طریقہ کار کا نیا تصور مضمر ہے۔ (9)

محمود ہاشمی کے علامت کے حوالے سے افکار منطق سے پرے اور مابعد الطبیعیات کے قریب ہیں۔ وہ علامت کو سماجی قدر یا ادبی تکنیک، رجحان یا مزاج سے ہٹ کر اسے مہابیانیہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، جس سے انسانی مسائل

اور ان کے حل کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ رویہ ترقی پسندی کے ردّ میں باغیانہ عمل تو ہو سکتا ہے تاہم تفکیری اور منطقی نہیں۔

محمد علی صدیقی (۱۹۳۸ء۔۲۰۱۳ء) ترقی پسند ناقدین کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے دیوارِ برلن کے انہدام کے بعد بھی مارکسیت کے فکری تناظرات کو اپنی تحاریر میں زندہ رکھنے کی مسلسل سعی کی۔ اپنے مضمون "استعارہ اور علامت" میں انھوں نے استعارہ اور علامت کے مابین فرق کو نوعِ انسانی کی عمر جتنا قرار دیا ہے۔ دراصل وہ استعارہ سازی کے عمل کو بہت قدیم تصور کرتے ہیں کہ اوّلین رزمیہ شاعری میں تمثال سازی، دراصل استعارہ سازی کا ہی عمل ہے۔ استعارہ میں چیزوں کے اُن علائق کو اجاگر کیا جاتا ہے، جن کا ادراک پہلے کسی کو نہ ہوا ہو۔ محمد علی صدیقی کے نزدیک استعارے مستقلاً افکار و تصورات کی مکمل تصویریں نہیں رہ پاتے، بلکہ " افکار کی قسمیں یا ان کے حصول کی علامتیں بن جاتے ہیں۔"علامت استعارہ کے مقابلے میں کسری ادراک کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن اس میں موجود بے پناہ اشاراتی قوت استعارہ کی نمائندگی کرتی ہے اور نفسِ ادراک پر حاوی ہو کر مفاہیم کی ترسیل کو رواں اور جامع بنا دیتی ہے۔ کامیاب علامت نگاری اپنی پختہ حالت میں اعلیٰ پائے کی تمثال سازی بن جاتی ہے جو انسانی تجربہ کو گہرائی اور ترفع بخشتی ہے۔(10)

محمد علی صدیقی کے نزدیک استعارہ علامت کی بنیاد ہے، بلکہ علامت کو توسیع شدہ استعاروں (Extended Metaphos) کا روپ سمجھنا چاہیے۔ استعارے کے مستقل نہ ہونے کے باعث علامت کا ظہور ہوتا ہے، جو تمثال کے روپ میں حقیقت کی گہرائی کی ترسیل کرتی ہے۔ بالعموم علامت میں معانی کی ترسیل اس طرح رواں انداز میں دکھائی نہیں دیتی، بلکہ استعارہ اور علامت متن میں موجود معنی کے ابلاغ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، اس لیے صدیقی صاحب نے علامت کے اس تفاعل کے لیے "کامیاب علامت" ہونے کی شرط عائد کر دی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی جدید علامت نگاری کو حدفِ تنقید بناتے ہیں، جہاں ادب میں ابلاغ کے فریضے کو پسِ پشت ڈال کر علامت ہی کو غایت اولیٰ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی علامت کی اہمیت اور عظمت کے انکاری نہیں، بلکہ وہ علامت کو بدلتے وقت اور پیچیدہ تر ہوتی انسانی زندگی کی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ بدلتے وقت میں جہاں ایک صدی پیشتر علم، کئی علوم میں منقسم میں ہو گیا اور کم سے کم شے کے بارے زیادہ سے زیادہ جاننے کو علم قرار دے دیا گیا، وہیں زندگی کرنے اور زندگی کے اطوار سمجھنے میں بھی جدت آنے لگی۔ زندگی کی کلیت کو تشکیل دینے والے اجزا ہی کو پوری کلیت میں زندگی کی ارفع صورت گری کے حوالے سے دیکھا جانے لگا۔ زندگی کی حقیقت کو آشکار کرنے کرنے والے استعارے تہی دکھائی دینے لگے استعارہ سے زیادہ تر طاقت ور نشان کی ضرورت پڑی تو علامت نے زندگی کی

تشریح کا کام اپنے سر لیا اور پھر علامت تشکیل دی جانے لگی۔ اس نوع کی علامت کی اپنی اصل میں سہل اور معانی سے بھرپور ہوتی ہے، تاہم علامت کے تفاعل کا انحصار اس کے خالق پر ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

> علامت استعارہ سے کہیں زیادہ سلیس، کہیں زیادہ Lucid ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کا استعمال کرنے والا اس درجہ کا اعلیٰ فنکار ہو کہ وہ اپنی علامت یا علامتوں کے لیے اپنے قارئین یا سامعین کے ذہن میں وہ بنیادی myth لا کھڑی کر دے جس میں وہ علامت سانس لیتی ہے۔ اگر علامت شخصی ہے۔۔۔ تب بھی شخصی علامت اپنی تلازموں کی مدد سے اس درجہ روشن sign post کا روپ دھار لیتی ہے کہ علامتوں کے ذریعے تخلیقی محاکات واضح تر ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو پا رہا تو اس میں علامت یا extended metaphor کا قصور نہیں بلکہ یہ فنکار کا عجز ہے۔(11)

یعنی علامت سازی کا عمل فطری یا خود مکتفی نہیں، بلکہ کامیاب اور واضح علامت سازی فن کی پختگی پر منحصر ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے گنجلک علائم کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے، "ادب برائے ادب" کے نقطۂ نظر سے جڑے شعرا پر چوٹ کی ہے کہ یہ شعرا اپنے اظہار کو سادہ و سلیس رکھنے کے خوگر نہیں ہوتے اور لسانی و تخلیقی کھیل کی بنیاد پر قاری سے داد کی توقع رکھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ علامت نگار شعرا جو کلاسیکی شعریات سے جڑے علامتی نظام کے تحت علامت سازی کرتے ہیں ان کی علامتیں استعارے کی توسیع ہوتی ہیں، جن کی تفہیم نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ مضمون نگار نے ترقی پسند شعرا کو رعایت دینے کی غرض سے، ان کے نام درج کر کے بتایا فیض، مخدوم، اختر الایمان، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور عزیز حامد مدنی ایسے شعرا نے استعاروں ہی کو علامتی شکل دی، تاہم ان کی شخصی علامتیں بھی کسی باقاعدہ شعری روایت اور کسی مستقل علامتی نظام سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر شعرا نے تناقض، تضاد، اہمال اور ابہام سے کام لے کر اعلیٰ پایہ کا ادبی کام لیا ہے۔

محمد علی صدیقی نے ابہام اور اہمال کو کثیر المعنویت کی حامل اعلیٰ شاعری کی بنیاد بتا کر ایک طرف جدید شعرا کی قبولیت کے لیے راہ ہموار کر دی ہے، دوسری طرف 'مستقل علامتی نظا' (جو یقیناً ان کے نزدیک ترقی پسند نظام ہے جس سے زیادہ واضح اور متعین نظریات کا حامل شاید ہی کوئی نظام اردو ادبی منظر نامے سے کبھی متعلق رہا ہو۔) کا ذکر کر کے انھوں نے آزادانہ طبیعت کے حامل تفکیری شاعروں کا راستہ بند بھی کر دیا ہے۔ وہ اس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ علامت استعارہ اور علامت نگاری ایک طرزِ نگارش کی بجائے ایک طریقۂ فکر ہے، جو اکثر لوگوں کو میسر نہیں، کہ استعارہ و علامت فہمی کی استعداد چند ہی قارئین میں پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں اس سائنسی فکر کے دور میں کسی بھی علامت کو ماورائے تشریح سمجھنا ذہنی کج روی ہے۔ علامت

اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود نفسِ مضمون کے باطن میں پائی جانے والی ابہام، اہمال اور تناقض کی صورتِ حال کو دور کر ایک ایسا معنوی ربط قائم کرتی ہے، جس سے اس کی تفہیم و تعبیر آسان ہو جاتی ہے۔ کامیاب علامت نگار کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی منطق اور باطنی منطق کو ایک دوسرے پر منطبق کر کے صفحہ قرطاس پر معانی کا رقص برپا کر دے۔ محمد علی صدیقی کے مطابق ترقی پسند شعرا نے علامت سے زندگی کی تفہیم کا کام لیا ہے ،جب کہ دوسری طرف ادب برائے ادب کے قائل جدید علامت نگاروں نے علامت سے حقائق کے اخفا کا کام لیا ہے۔ یہ طرزِ ادا "جدید فشن ایبل افکار و نظریات " کے زیر اثر ہے، جن کے ترقی پذیر ممالک کسی طور متحمل نہیں ہو سکتے، محمد علی صدیقی طنزاً لکھتے ہیں کہ علامت کی تعریف یوں کرنی چاہیے کہ یہ ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے شعرا شاعری کو تجرید بنا دیتے ہیں۔(12)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے استعارہ اور علامت کو بہر طور واضح کرنے کی کوشش کی ہے: استعارہ نادیدہ اشیا و افکار کے اظہار کا ذریعہ ہے تو علامت استعارے کا حصہ اور اس کی توسیع ہے۔ علامت ایک طرز فکر اور طرزِ زندگی ہے جو زندگی کے حقائق کو ان کی گہرائیوں سمیت آشکار کرتی ہے۔ تاہم صدیقی صاحب علامت کے تمام تخلیقی زاویوں کو واضح کرنے کے بعد اس کے نظم میں استعمال کے حوالے سے جانبدار نہیں رہے۔ علامت کو ترقی پسند شعرا اپنی نظم میں استعمال کریں تو وہ واضح اور معنی آفرینی کی حامل قرار پاتی ہے، جس کی تفہیم و تعبیر منطقی اور سائنسی بنیادوں پر آسان ہوتی ہے۔ لیکن 'ادب برائے ادب' سے جڑے شعرا کی نظموں میں یہ علامت نگاری ذہنی کج روی کی مثال اور ناقابلِ تفہیم قرار پاتی ہے۔ دراصل نظری حوالے سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے استعارہ و علامت سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم جب وہ اپنی بحث کو معاصر ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اُن کی ترجیحات اُن کو من چاہا اور متعین فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں، جو انھوں نے اس مضمون میں کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان (۱۹۴۸) کے مطابق لفظ سمبل (symbol) یونانی لفظ Symobolon سے نکلا ہے جو خود دو لفظوں sym اور bolon سے مل کر بنا ہے۔ پہلے لفظ کا معنی ساتھ ہے جب کہ دوسرے کا معنی پھینکا ہوا ہے یعنی اس کا مطلب الگ الگ اشیا کو اکٹھا کر کے ساتھ میں پھینکنا۔ سہیل احمد علامت کو فن کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ دراصل علامت انسان کے مختلف خیالات اور تجربات کو جوڑ کے رکھتی ہے۔ علامت میں تجربے کی مختلف سطحیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جن اشیا کی یہ نمائندگی کرتی ہے اُن سے اس کی مشابہت ریاضیاتی انداز کی نہیں ہوتی بلکہ انسانی ذہن اور اس کے پیچیدہ عمل ہی کا عکس علامت میں نظر آتا ہے۔ اُن کے نزدیک علامتی ادب تعبیر کا تقاضا کرتا ہے ، تعبیر کے بغیر فن کا حقیقی شعور پیدا نہیں ہو سکتا۔(13)۔ کچھ لوگوں کو خوف ہے کہ

علامت کی تشریح کی جائے تو وہ اپنی قدر کھو کر نشان بن جاتی ہے، دراصل یہ حقیقت نہیں۔ حقیقی علامت وجود کی سب سطحوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس لیے شرح و تعبیر سے اس کی طاقت ختم نہیں ہوتی۔ سہیل احمد خان کے نزدیک کچھ ناقدین شرحِ متن کے لیے متن سے باہر جھانکنا گوارا نہیں کرتے، حالانکہ شرح و تعبیر کے لیے باہر جانا پڑے گا، بالخصوص علامت کی تعبیر کے تہذیب و ثقافت اور ان منطقوں سے لازماً رجوع کرنا پڑے گا جہاں علامت متشکل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سہیل احمد کے نزدیک علامتوں کی تعبیر کے لیے مابعد الطبیعیات سے رجوع کرنا سب سے احسن عمل ہے، کہ اس میں دیگر علوم بالخصوص نفسیات سے آگے بڑھ کر تخلیق کار کے نظامِ فکر تک رسائی کی صلاحیت موجود ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان علامت کی نوعیت و ماہیئت بتانے میں کوئی نیا پہلو سامنے نہیں لاتے، ان کا سروکار اطلاقی تنقید سے رہا ہے اور انھوں نے کئی علامتی متون کی گرہ کشائی ہے، لیکن متن سے باہر متن کی تعبیر اور مابعد الطبیعیات کو علامت کی تعبیر کی کلید قرار دینا قرین قیاس نہیں لگتا۔ علامت کی تشکیل کو تہذیب و ثقافت اور دیگر سیاسی و سماجی تناظرات کے تحت ہو سکتی ہے تاہم کوئی بھی لفظ علامتی معانی تخلیقی متن میں رہ کر دیتا ہے، لہٰذا متن مرکوز تعبیر ہی پیش کردہ حقائق کی عکاس ہو گی۔ تاہم ان کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ علامت اور علامتی متن کو معتوب کہنے کے بجائے اس کی شرح و تعبیر کی جانب توجہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا (۱۹۲۲ء۔ ۲۰۱۰ء) علامت کی توضیح تشبیہ اور استعارے سے جوڑ کر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تشبیہ دو چیزوں کی مشابہت کو کھول کر بیان کرتی ہے جب کہ استعارہ اس مشابہت کی بابت فقط اشارہ کر دیتا ہے۔ علامت اور استعارہ دونوں کا افق محدود ہے، ان کے مقابلے میں علامت ان دونوں سے ایک قدم آگے بڑھنے کا نام ہے؛ علامت میں فقط دو چیزیں آپس میں جڑتی نہیں بلکہ ان کے جڑنے سے تیسری شے کا جنم ہوتا ہے جو ان دونوں کے حاصل جمع سے زیادہ ہوتی ہے بلکہ ان سے مختلف بھی۔ وہ اس کی مثال سمندر اور آنکھ کی مماثلت کے بیان سے دیتے ہیں۔ تشبیہ میں آنکھ اور سمندر میں آپسی مناسبت کا بیان ہے، استعارہ میں آنکھ سمندر ہی کا روپ ہے اور آنکھ میں سمندر کی گہرائی، وسعت، بیکرانی اور ابدیت کے تصورات سامنے آتے ہیں، جب کہ علامت استعارے کی توسیع شدہ حالت بن کر دونوں اشیا میں نئے نئے منطقے دریافت کرتی ہے۔ جب کوئی علامت محض مشابہت تک محدود ہو گی تو زیادہ سے زیادہ دو معانی کی توسیع ہو گی، لیکن جب اس کا مماثلت کا دائرہ کشادہ ہو گا تو اس سے ان گنت معانی پھوٹیں گے۔ وزیر آغا علامت کے تفاعل کی اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "علامت شے کو اس کے مخفی تصور سے منسلک کرتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ جب شے علامت کا روپ اختیار کرتی ہے تو قاری کے ذہن کو اپنے مخفی تصور کی طرف موڑ

دیتی ہے۔ جب شاعر کسی شے یا لفظ کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے تو اپنی تخلیق جست کی مدد سے اس شے اور اور اس کے مخفی معانی میں ایک ربط دریافت کرتا۔ شاعر کا سارا جمالیاتی حظ اس کی اسی جست کے باعث ہے۔ (14)

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق نشان اور علامت میں فرق ہے، بظاہر ایک علامت سے کوئی معنی چپک جائے تو ذہن میں وہ لفظ آنے سے فقط وہی ایک مفہوم ابھرے گا اور وہ علامت کی بجائے نشان کہلائے گا یعنی وہ یک رُخی، سطحی اور اکہری علامت کو نشان کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک 'عام فہم علامت'، 'روایتی علامت' اور 'پرائیویٹ یا ذاتی علامت' میں سے 'ذاتی علامت' کے اندر یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ شاعر پہلے سے استوار انسلاکات کو پار کر کے نئی معنیاتی دنیا خلق کرے۔ اعلیٰ ادب ہمیشہ علامتی ہوتا ہے۔ علامتی ادب میں وقت کو شکست دے کر زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک علامتی ادب تجریدی نہیں ہوتا کہ ہر دو میں فرق ہے۔ تجرید سے مراد بے صورت (Non-Representational) ہونا ہے جب کہ علامت میں امیج قائم رہتا ہے۔ علامت متخیلہ کے تحت تجرید کی حدوں کو چھوتی ضرور ہے، جب وہ صورت کو کسی ایک معنی کے شکنجے سے آزاد کرا کے کثرتِ معانی میں داخل کرتی ہے، مگر یہ تجرید امیج ہی کے تحت رہتی ہے اس سے منقطع نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر وزیر آغا علامت کی حدود کا بھی تعین کر دیتے ہیں، جب علامت میں ایک شے دوسری شے اور تصورات کی نمائندگی کرتی ہے تو ان کے بقول:

یہ اظہار کی طرف محض پہلا قدم ہے کیوں کہ علامتی اظہار کہیں رکتا نہیں بلکہ قدم بہ قدم پھیلتا چلا جاتا ہے تا آنکہ ابہام کی دھند میں جذب ہو کر معنی آفرینی کے وصف سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب یہ مقام آجائے تو سمجھیے علامت کی کارکردگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ (15)

درج بالا اقتباس کے پیش نظر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ وزیر آغا کے نزدیک جب کہ معنیاتی توسیع کی علم بردار علامت کی ان کے نزدیک حقیقی علامت ہے۔ یعنی وزیر آغا علامت کو کثرتِ معانی کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور اسی کو شاعری کی نمایاں خصوصیت۔ تاہم معنی آفرینی اور وسعت کی حامل علامت بھی اُن کے نزدیک محدود معانی رکھتی ہے کہ ایسا مقام آتا ہے جہاں علامت کی معنی خیزی بند ہو جاتی ہے، اس مقام کو وہ ابہام کہتے ہیں۔ یہاں سے اُن کا تصورِ ابہام بھی سامنے آجاتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ابہام کو دھند، معنوی خلل اور عجز قرار دیتے ہیں، جس کے در آنے سے معنی خیزی کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ تاہم یہاں یہ سوال کرنا عین مناسب ہو گا کہ

وہ کون سی وجہ ہوتی جس کے باعث ایک علامت سے مسلسل بر آمد ہوتے چلے جاتے ہیں؟ در حقیقت علامت ہی وہ ابہام پیدا کرتی ہے جو ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کی جانب اشارہ کرتا ہے اور اس طرح معنی خیزی کا عمل جاری رہتا ہے۔ چوں کہ کلام میں علامت اپنے متنی سیاق اور متعلقہ تناظرات سے جڑ کر معنی خیزی کر رہی ہوتی ہے تو جہاں سیاق ختم ہوتے ہیں اور تناظرات متعلق نہیں رہتے، تو علامت مزید معانی فراہم کرنے سے عاجز آ جاتی ہے۔ یعنی ابہام اس نقطۂ انقطاع سے پہلے کی صورتِ حال ہے نہ کہ بعد کی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "علامت کی پہچان" علامت کی تفہیم کے کچھ نئے پہلو سامنے لاتا ہے۔ ان کے نزدیک تشبیہ، پیکر، استعارہ اور علامت تخلیقی زبان کی شرائط ہیں۔ ان میں سے کم از کم دو عناصر کا تخلیقی زبان میں ہونا ضروری ہے ورنہ وہ تخلیقی نہیں کہلائے گی۔ فاروقی صاحب کے مطابق تشبیہ دو مختلف اشیا کے درمیان نقطۂ اشتراک دریافت کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ہے۔ ہر دو لفظ جو جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک یا زیادہ کو متوجہ اور متحرک کرے پیکر (image) ہے یعنی پیکر حواس کے تجربے کے ذریعے سے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ ہیں، 'ورق گردانی'، 'ایک جہاں ہنگامہ'، 'بت خانہ' وغیرہ پیکر ہیں۔ استعارے کے حوالے فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ یہ بھی دو مختلف اشیا میں مشابہت اور اشتراک تلاش کرنے کا نام ہیں بشرطیکہ اشتراک واضح نہ ہو، دونوں اشیا میں تعلق مجاز کی بنیاد پر ہو اور دونوں اشیا میں سے ایک یعنی مستعار منہ ظاہر ہو۔ ایک نکتہ مزید بھی بیان کرتے ہیں کہ استعارہ کی بنیاد مشاہدے پر ہو نہ کہ علم پر۔ استعارہ کا استعمال شعوری ہوتا ہے اور جب لگتا ہے کہ شعوری اور سوچا سمجھا نہیں ہوتا تو تب بھی استعارہ تحت الشعوری اور غیر شعوری ہوتا ہے جو ذہن کے نہاں خانوں میں پہلے سے موجود ضرور ہوتا ہے۔ (16)

فاروقی صاحب کے نزدیک ناقدین نے مذہبی، تہذیبی اور ریاضیاتی قسم کی علامتوں کو بھی زیرِ بحث لا کر مباحث کو گنجلک کر دیا ہے، حالانکہ ادبی تنقید سے جڑے لوگوں کو صرف انھی علامتوں سے تعلق ہونا چاہیے جو ادب کا حصہ بن سکیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ غیر ادبی علامتیں فی نفسہٖ بے معنی ہوتی ہیں، جیسے ریاضیاتی اور سائنسی علوم کی علامتیں، جب کہ ادب کا حصہ بن سکنے والی علامتیں پہلے سے ہی با معنی ہوتی ہیں، ان میں وہ انوکھا پن اور شدت موجود ہوتی ہے جو ادبی متن کو معنی آفریں بنا دیتی ہے۔ علامت استعارے کی طرح فقط مشاہدے کی بنیاد پر نہیں ہوتی، بلکہ علم کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ مشاہدے کی ضد ہوتی ہے، توسیع نہیں، لیکن شعور کی گرفت میں آنے کے بعد اس کا علامتی کردار برقرار رہتا ہے۔ اردو شاعری میں گل، بلبل، قاصد وغیرہ اس وقت تک علامتی معانی دیتے رہے جب تک شاعر ان کو مخصوص معانی پہنانے پر قادر تھا، لیکن جب شعرا نے انھیں عادتاً استعمال کرنا شروع کیا تو یہ الفاظ علامتی معانی دینے سے عاجز آئے۔ دن، رات، سورج، چاند، دھوپ چھاؤں کیسے

الفاظ کے حوالے سے فاروقی صاحب کی رائے ہے کہ ان الفاظ کی توانائی خرچ ہو چکی ہے، اب ان میں علامت بننے کی اہلیت نہیں رہی۔ کوئی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا حامل تخلیق کار ہی ان کو علامت بنا سکتا ہے۔ علامت کو شعوری طور پر تخلیقی عمل سے تشکیل دیا جاتا ہے لیکن کسی شاعر کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کسی بھی وقت اپنی مرضی کی علامت ایجاد کر لے۔ کسی نظم میں جب علامت کی تکرار کی جائے تو وہ ایک نظام کی نشان دہی کر رہی ہوتی ہے اور اگر ایک علامت ایک نظم میں ایک ہی بار آئے تو غیر قطعیت اور کثیر المعنیت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ فاروقی صاحب کے بقول:

> "کسی ناقابلِ ترجمہ کثیر المعنویت سے بھرپور لفظ کو جب شاعر بار بار استعمال کرتا ہے تو اس کی علامتی حیثیت کے بارے میں شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن یہ کثیر المعنویت Arbitrary نہیں ہوتی اور نہ انتخابِ معنی کی قائل ہوتی ہے۔(17)

یعنی ایک مروجہ اور اور مستحکم معانی کی حامل علامت کو بالکل الگ معانی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیق کار کو وضاحت دینی پڑے کہ اُس نے علامت فلاں معنی میں استعمال کی تھی۔ سُرخ رنگ خون، قربانی، انقلاب اور جذبے کی شدت وغیرہ کے لیے ہی برتا جاتا ہے ان معنی سے ہٹ کر بالکل متضاد معانی میں اس کا استعمال علامت کو ناکام کر دے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اردو جدیدیت کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے رسالے شب‌خون کے ذریعے جدید علامتی ادب کو فروغ حاصل ہوا، لیکن اس مضمون میں انھوں نے علامت کے ضمن میں اُس آزادی کا ذکر کہیں نہیں کیا جس کو بنیاد بنا کر 'نئی شاعری' اور 'نیا افسانہ' لکھا گیا تھا۔ فاروقی صاحب زبان کے اپنے استعاراتی اور علامتی نظام کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن اس کی طرف کم ہی توجہ کرتے ہیں اور استعارہ و علامت کی تخلیق کو فرد کی صلاحیت ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے جدید نظم میں انفرادی علامتوں کی بھی وضاحت نہیں کی۔ وہ علامت کو کثیر المعنویت پیدا کرنے کی وجہ تو ضرور مانتے ہیں لیکن ثقافت میں مروجہ علامتی معانی پر قناعت کا کہہ کر علامت کے امکانات کو محدود کر دیتے ہیں۔ البتہ 'غیر معمولی تخلیقی صلاحیت' کے حامل شخص کے لیے وہ یہ گنجائش ضرور چھوڑتے ہیں کہ وہ معمولہ اور پیش پا افتادہ علامتوں کو بھی نئے معانی عطا کر دے اور نئی علامتیں بھی تشکیل دے سکے۔

معروف معاصر نقاد عتیق اللہ (پ:۱۹۴۱ء) اپنے مضمون "آر کی ٹائپ: تصور اور تنقید" میں علامت کو لسانی نظام کے علاوہ تہذیبی اور تاریخی نظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق ادب کا توسیاتی تصور کارل یُنگ کے نظریے پر استوار ہے۔ اس تصور میں علامت کو فقط فرد کی داخلیت اور تخلیقیت کے ساتھ ایک وسیع عمل

سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ ادب اور ادب میں علامت فقط لفظوں کا کھیل نہیں بلکہ اس کی تشکیل میں بعید ترین مشابہتیں، قدیم تر انسانی روابط، رسوم اور روحانی کیفیات کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہ سب فرد کے انفرادی تجربہ کے علاوہ اس کے اجتماعی شعور میں موجود تجربات کی وجہ بھی متشکل ہوتا ہے۔(18)۔ علامت ایسے ابہام کی راہ روشن کرتی ہے جو ان سب تک رسائی میں معاون ہو سکتا ہے۔ آر کی ٹائپ فقط علامت ہی نہیں رہتی ایک نظام نقاد بن جاتا ہے تو علامت کی تشکیل کے ساتھ مکمل تخلیقی عمل تک رسائی کا داعی ہے، بقول عتیق اللہ:

" قوسیاتی تنقید لفظ کے پسِ پشت موج زن تصورات، انسلاکات، وسیع تر انسانی اور تہذیبی روابط، مخفی و جبلی خواہشات، ذاتی و اجتماعی گروہوں، خوابوں اور اندیشوں کو اپنے مطالعے میں مرکزی درجہ تفویض کرتی ہے۔(19)

آر کی ٹائپ کے پیشِ نظر علامتوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اس طرح علامت کی تعبیر میں اساطیر، تاریخ، مذہب اور ان سے جڑے کئی دائروں کو بحث میں لانا پڑے گا۔ تخلیق کار کا شعور اور لاشعور اگر صدیوں کے تجربات کی آماجگاہ ہو سکتا ہے تو اسی سے برآمد ہونے والی علامت بھی ایسا ابہام تشکیل دیتی ہے تو حیرت انگیز طور پر کثرت معانی کے در کھول دیتی ہے۔ تاہم یہ سب تسلیم کرنے سے قاری ذمہ داری بھی حد درجہ بڑھ جاتی ہے کہ تاریخ و تہذیب اور نفسیات ایسے کئی علوم میں دسترس رکھنے والا قاری ہی اس نوع کی علامات کی منصفانہ تعبیر کا حق ادا کر پائے گا۔

معروف ترقی پسند مدیر اور نقاد ڈاکٹر سید عامر سہیل (پ:۱۹۶۹ء) علامت کو استعارے ہی کی وسیع شکل سمجھتے ہیں۔ استعارہ تخلیقی تجربے کو لسانیاتی ترتیب اور معنیاتی تہہ داری کے ذریعے اُجاگر کرنے کا نام ہے اور یہی استعارہ بدلتے وقت اور تناظر کے ساتھ نئے معنی ظاہر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اُن کے نزدیک جب کوئی استعارہ ثقافت اور سماج کے کسی پیرائے میں ڈھل کر وسعت اختیار کرتا ہے تو علامت بن جاتا ہے، جسے استعمال کر کے کوئی تخلیق کار کسی ایسے مثالی معانی کی صورت گری کرتا ہے، جس کی تشکیل علامت کے علاوہ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ ویسے تو زبان میں علامتوں کا مجموعہ ہے، لیکن زبان کی عمومی علامتیں متعین معانی کی حامل ہوتی ہیں، جن میں وقت کے ساتھ جزوی تغیر آتا ہے، لیکن "علامت" کا تفاعل اس سے قدرے مختلف ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عامر سہیل:

" علامت ایک مکمل جمالیاتی تجربے اور اس تجربے کی تمام تر جزئیات کے ساتھ اظہار کا نام ہے، ایک ایسا اظہار جو معنیاتی پھیلاؤ سے ایک نکتے پر پھر اس نکتے سے نئے انکشاف کی طرف لے جائے۔ حقیقتاً علامت زندگی کی لامحدود جہتوں سے نئے معنی

اخذ کرنے کا عمل ہے اور ایک ایسا ذریعہ ہے جو شاعر یا ادیب کے داخلی وفور کو نئے معانی ہی عطا نہیں کرتی بلکہ تہہ در تہہ مفہوم سے روشناس کرتی ہے۔(20)

یعنی ڈاکٹر سید عامر سہیل تین نوع کی علامتوں کے قائل ہیں۔ اولاً: زبان میں موجود علامتیں؛ جو اشیا کے اسما اور اشاروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ثانیاً تہذیب و ثقافت اور سماج کی تشکیلی علامتیں؛ جو زبان کا حصہ بن جاتی ہیں، ان میں معنیاتی تغیر موجود ہوتا ہے۔ ثالثاً ادیب کی تخلیق کردہ علامتیں؛ جو اپنی بنیاد میں کثیر المعانی ہوتی ہیں اور قرأت کے عمل کے درمیان ان معانی کے امکان تہہ در تہہ روشن کرتی ہیں۔ تاہم علامتوں کی قرأت عام متون کی قرأت سے زیادہ فعالیت کی متقاضی ہوتی ہیں۔ علامتیں جن سیاسی، سماجی اور تہذیبی سیاق سے وجود میں آئی ہوتی ہیں، ان کے شعور کے بغیر علامتوں کے مکمل معانی تک پہنچنا قاری کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عامر سہیل کے نزدیک علامت ابلاغ کے ساتھ اخفا کا کام بھی کرتی ہے؛ دوہری خصوصیات کی حامل علامت جہاں تخلیقی انکشاف کرتی ہے وہیں کچھ اشیا پر پردہ بھی ڈالتی ہے، تاہم کچھ ایسے اشارے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر فہیم اور نکتہ جو قاری اُن نہاں معانی تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

اردو میں علامت نگاری کے مجموعی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر ناقدین بالعموم علامت کو استعارے کی توسیع شدہ حالت قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق استعارہ میں لفظ کے لغوی اور استعاراتی معنی کے درمیان میں خارجی قرینہ ہوتا ہے جو قاری کو حقیقی و معانی کو جوڑنے اور استعارے کے عمل کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ علامت میں یہ قرینہ خارجی نہیں بلکہ داخلی اور عقلی ہوتا ہے، لیکن جدید علامت نگاری میں اس داخلی قرینے کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا، جس سے منطقی ربط نہیں رہ پاتا اور قاری کوشش کے باوجود بھی معانی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اکثر ناقدین نے جدیدیت کے زیرِ اثر کی جانے والی علامت نگاری کو پیشِ نظر رکھ کر اسے معتوب ہی گردانا ہے جو ابہام کا باعث بن کر عجز کلام بن جاتی ہے۔ یہاں بھی ناقدین ابہام کو کثرتِ معنی کی بجائے نقصِ کلام قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، تاہم علامت کی وجہ سے کثرتِ معنی کے جنم کا استقبال کرتے ہیں۔ دراصل یہ مختلف نظریات کی عدم تفہیم اور مباحث میں ردّ عمل کے اثر کا نتیجہ ہے کہ ناقدین کی اکثریت چیزوں کو کلیت میں دیکھنے کی بجائے اجزا میں منقسم کر کے دیکھتی ہے اور من پسند نتائج اخذ کر لیتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

1۔ جیلانی کامران، "شاعری میں علامتوں کا مسئلہ"، مشمولہ ادبی دنیا، شمارہ ۱۱، (لاہور:۱۹۷۸ء)، ص ۲۲۳۔

2۔ شوکت سبزواری، *معیارِ ادب*، (کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۱ء)، ص ۹۵۔

3۔ ایضاً، ۹۷۔

4۔ صدیق کلیم، "علامتی اظہار"، مشمولہ علامت نگاری کے مباحث، مرتبہ: اشتیاق احمد، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۳۔

5۔ ایضاً، ص ۵۷۔

6۔ ڈاکٹر ابنِ فرید، "علامت نگاری کا تصورِ زمانی و مکانی" مشمولہ اوراق، شمارہ ۳، (لاہور: نومبر ۱۹۶۸ء) ص ۳۴۶، ۳۴۷۔

7۔ ڈاکٹر ابنِ فرید، "دیومالا اور علامت"، مشمولہ علامت نگاری کے مباحث، ص ۷۱۔

8۔ محمد حسن عسکری، ادب کا علامتی نظام، مشمولہ تنقید کی جمالیات، جلد نہم، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء)، ص ۹۹۔

9۔ محمود ہاشمی، "علامت اور نیا تخلیقی تصور"، مشمولہ مشمولہ علامت نگاری کے مباحث، ص ۱۳۸۔

10۔ محمد علی صدیقی، "استعارہ اور علامت"، مشمولہ مضامین، (کراچی: ادارہ اعصرِ نو، ۱۹۹۱ء)، ص ۴۴۔

11۔ ایضاً، ص ۴۷۔

12۔ محمد علی صدیقی، "ادب میں علامت پسندی" مشمولہ سیپ، (کراچی: دسمبر ۱۹۶۸ء)، ص ۱۱۹۔

13۔ سہیل احمد خان، *سرچشمے: علامتوں کی تلاش*، (لاہور: ققنس، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۳۔

14۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۸ء)، ص ۴۳۔

15۔ وزیر آغا، "علامت کیا ہے" مشمولہ معنی اور تناظر، (سرگودھا: مکتبۂ نردبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۵۰۔

16۔ شمس الرحمٰن فاروقی، "علامت کی پہچان"، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر، (الہٰ باد، بھارت: شب خون کتاب گھر، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

17۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

18۔ Renos K. Papadopolous, (Edited), The Handbook of Jungian Psychology: Theory, Practice, (London , New York: Routledge, 2006), p118.

19۔ پروفیسر عتیق اللہ، "آرکی ٹائپ: تصور اور تنقید"، مشمولہ تنقید کی جمالیات، جلد ۸، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۸۱۔

20۔ ڈاکٹر سید عامر سہیل، *مجید امجد: نقش گرِ ناتمام*، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۲۵۔